عرفان صدیقی

کینوَس

عرفان صدیقی

آج کالج کے ڈرامے میں بہت لطف آیا
کتنا اچھا تھا شبِ موسمِ گرما کا وہ خواب
"تم مرے کمرے میں کیوں چھوتے ہو کاغذ میرے؟
بزمِ اقبال کے جلسے کی یہ تیاری ہے"
(جانے تصویر وہ کس کی ہے، مگر پیاری ہے)
انجمن اپنی بنالی ہے زمینداروں نے
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
"میں سمجھتا ہوں کہ روشن ہے وہاں مستقبل"
(کیا کبھی حال میں ہم لوگ نہیں جی سکتے)
اور پھر بندھتا ہے بازو پہ امامِ ضامن
"میں وہاں جا کے تمھیں بھیجوں گا اپنی تصویر"
(اور سینے میں اتر جاؤں گا نشتر بن کر)
کسی مورث کے لیے پنج ہزاری منصب
اور تولیتِ اوقاف کا اعزاز کہیں
آگے بڑھنے کے لیے بانڈ الگ کرنے ہیں
علم صدیوں سے وراثت ہے تمھارے گھر کی
(عہدِ رفتہ کی مہک بند ہے صندوقوں میں)
کیسا آشوب تھا اشراف پہ ستاون میں
ان کو جس وقت فرنگی نے طمنچہ مارا
کچھ مہینوں کی دلہن، اس کو خبر کچھ بھی نہ تھی
ہاتھ سے چھوٹ کے کنگھی گری، اور ٹوٹ گئی

اب تری گرمیِ گفتار سے یاد آتا ہے
ہم نفس، ہم بھی کبھی شعلہ زباں تھے کتنے

وقت کے ہاتھ میں دیکھا تو کوئی تیر نہ تھا
رُوح کے جسم پہ زخموں کے نشاں تھے کتنے

کسی تعبیر نے کھڑکی سے نہ جھانکا، عرفانؔ
شوق کی راہ میں خوابوں کے مکاں تھے کتنے

○

ہم اہلِ شعر جو حُسنِ خیال سے بھی گئے
تو دلبرانِ غزل خط و خال سے بھی گئے

بچھڑ گئے کہیں رستے میں ہمسفر موسم
گئے دنوں کے تعاقب میں حال سے بھی گئے

وہ کہہ گیا ہے پھر آئیں گے ہم اُداس نہ ہو
تو ہم خوشی سے بھی چھوٹے ملال سے بھی گئے

وہاں بھی اس کے سوا اور کچھ نصیب نہ تھا
ختن سے نکلے تو چشمِ غزال سے بھی گئے

وہ ہونٹ پند گروں کو بھی کر گئے خاموش
غریب مشغلۂ قیل و قال سے بھی گئے

○

کتنے دلدار تھے اربابِ ستم دلّی کے
چین ملتا ہے تو یاد آتے ہیں غم دلّی کے

کتنی بھولی ہوئی یادوں نے سنبھالا دل کو
جیسے پردیس میں ہوں دوست بہم دلّی کے

جانے کیوں کوئی سندیسہ نہیں لاتی پچھوا
کیا ہمیں بھول گئے اہلِ کرم دلّی کے

چاہے جس شہر میں رہ آئیں، مگر رہتے ہیں
زندگی دلّی کی، دل دلّی کا، ہم دلّی کے

یوں تو بُت خانہ ہے یہ شہر بھی لیکن عرفانؔ
آج تک پھرتے ہیں آنکھوں میں صنم دلّی کے

○

غزل تو خیر ہر اہلِ سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

کبھی شراب، کبھی انگبیں، کبھی زہراب
وصال کیا ہے کسی کے بدن کا جادو ہے

وہ بستیوں میں یہ انداز بھول جائے گا
ہرن کی شوخیِ رفتار بَن کا جادو ہے

بجھیں چراغ تو اس رنگِ رخ کا راز کھُلے
یہ روشنی تو تری انجمن کا جادو ہے

سُبک نہ تھا ترا بازوئے تیغ زن اتنا
ترے ہُنر میں مرے بانکپن کا جادو ہے

مرے خیال میں خوشبو کے پنکھ کُھلنے لگے
ہوائے دشت کسی خیمہ زن کا جادو ہے

○

موجِ خوں بن کر کناروں سے گزر جائیں گے لوگ
اتنی زنجیروں میں مت جکڑو، بکھر جائیں گے لوگ

قاتلوں کے شہر میں بھی زندگی کرتے رہے
لوگ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مر جائیں گے لوگ

اَن گنت منظر ہیں اور دل میں لہو دو چار بوند
رنگ آخر کتنی تصویروں میں بھر جائیں گے لوگ

جسم کی رعنائیوں تک خواہشوں کی بھیڑ ہے
یہ تماشا ختم ہو جائے تو گھر جائیں گے لوگ

جانے کب سے ایک سناٹا بسا ہے ذہن میں
اب کوئی ان کو پکارے گا تو ڈر جائیں گے لوگ

بستیوں کی شکل و صورت مختلف کتنی بھی ہو
آسماں لیکن وہی ہوگا جدھر جائیں گے لوگ

سُرخرو ہونے کو اک سیلابِ خوں درکار ہے
جب بھی یہ دریا چڑھے گا پار اُتر جائیں گے لوگ

○

دیکھ لے، آج تری بزم میں بھی تنہا ہوں
میں، جو گزرے ہوئے ہنگاموں کا خمیازہ ہوں

جانے کیا ٹھان کے اٹھتا ہوں نکلنے کے لیے
جانے کیا سوچ کے دروازے سے لوٹ آتا ہوں

میرے ہر جزو کا ہے مجھ سے الگ ایک وجود
تم مجھے جتنا بگاڑو گے میں بن سکتا ہوں

مجھ میں رقصاں کوئی آسیب ہے آوازوں کا
میں کسی اُجڑے ہوئے شہر کا سناٹا ہوں

اپنا ہی چہرہ انھیں تجھ میں دکھائی دے گا
لوگ تصویر سمجھتے ہیں میں آئینا ہوں

لمحۂ شوق ہوں، میری کوئی قیمت ہی نہیں
میں میسّر تجھے آجاؤں تو مہنگا کیا ہوں

میں بھٹکنے کے لیے ڈھونڈھ رہا ہوں موقع
اور وہ شوخ سمجھتا ہے کہ شرماتا ہوں

○

سنو، اتنی افسردہ کیوں ہو، اگر آج ہم کو بچھڑاتی بھی ہے چُپ رہو
یہی ریل گاڑی بہت دن کے بچھڑے ہوؤں کو ملاتی بھی ہے چُپ رہو

سبھی واقعات اور کردار اس طرح کی داستانوں میں فرضی سہی
مگر عام سی اس کہانی میں شاید کوئی بات ذاتی بھی ہے چُپ رہو

بچھڑتے ہوئے موسموں کی قطاروں کو آواز دینے سے کیا فائدہ
کہ آتی ہوئی رُت، پرندے بہت اپنے ہمراہ لاتی بھی ہے چُپ رہو

کسی شام کو پھر سُنیں گے یہی منتظر کان، مانوس قدموں کی چاپ
سڑک صرف بستی سے باہر ہی جاتی نہیں گھر تک آتی بھی ہے چُپ رہو

خفا ہو کے تم سے جُدا ہونے والے، اچانک کہیں پھر ملیں گے کبھی
بہت کچھ یہاں اختیاری سہی کچھ مگر حادثاتی بھی ہے چُپ رہو

گھر کی تنہائی ڈسے لیتی ہے، باہر چلیے
رات کو دیر تلک حلقۂ یاراں میں خروش
"آپ نے پھر ابھی کھانا نہیں کھایا" افسوس
آپ اس طرح تو کمزور بنا دیں گی مجھے"
(میں نے ملک کی سرحد سے پلٹ آؤں گا)
"رک کہ میں آیۂ کرسی تو ذرا دم کر دوں"

(مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
ان گنت رستے ہتھیلی کی لکیروں کی طرح
ان میں کوئی کشش کافِ کرم ہو شاید
میں کہاں جاکے رکوں گا، مجھے معلوم نہیں
حسن کب تجربۂ ذات میں ڈھل پائے گا
ظلمتیں، روشنیاں، سلسلۂ شام و سحر
سب تماشا ہے تو تقریبِ تماشا کیا ہے
حلقہ در حلقہ پراسرار سفر کی زنجیر
دیکھتے جاؤ کہ تم نے ابھی دیکھا کیا ہے

(ناتمام)

○

ہر جگہ فتنۂ محشر کی علامت ہے وہی
لکھنؤ میں بھی بتوں کا قد و قامت ہے وہی

بات کرنے لگے سناٹے تو معلوم ہوا
اب بھی خاموش زبانوں میں کرامت ہے وہی

کون ہم خانہ خرابوں کو کرے گا برباد
جو اس آشوب میں غارت ہے سلامت ہے وہی

آستیں پر کوئی دھبّہ تو نہیں ہے، لیکن
اس کی آنکھوں میں بہرحال ندامت ہے وہی

کم سے کم ایک روایت تو ابھی زندہ ہے
سر وہی ہوں کہ نہ ہوں، سنگِ ملامت ہے وہی

موجِ خوں ہو کہ ترے شہر کی دلدار ہوا
یار، جو سر سے گزر جائے قیامت ہے وہی

○

بزرگِ وقت، کسی شے کو لازوال بھی کر
تو کیسا شعبدہ گر ہے، کوئی کمال بھی کر

درخت ہوں تو کبھی بیٹھ میرے سائے میں
میں سبزہ ہوں تو کبھی مجھ کو پائمال بھی کر

یہ تمکنت کہیں پتّھر بنا نہ دے تجھ کو
تو آدمی ہے، خوشی بھی دکھا، ملال بھی کر

میں چاہتا ہوں کہ اب جو بھی جی میں آئے کروں
تجھے بھی میری اجازت ہے جو خیال بھی کر

پگھل رہی ہیں اس آشوبِ وقت میں صدیاں
وہ کہہ رہا ہے کہ تو فکرِ ماہ و سال بھی کر

نظمیں

صدائے آئنہ فروش

(والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ)

خدا کا شکر کرو
تمہارا ذہن، تمہارا بدن، تمہارا وجود
یہ سب تمہارے ہیں
یہ کائنات
یہ اظہارِ ذات کے نیرنگ
تمہاری فکر، تمہاری نظر
تمہارا ذوقِ سفر
رُتوں کے خیمے، پراسرار خوشبوؤں کے پرند
دکھوں کا دشت، سکھوں کے ہرے بھرے جنگل
رفاقتوں کی ہوائیں، رقابتوں کی گھٹن
ستم کی دھوپ

وفاؤں کے سایہ دار شجر
عنایتوں کا گداز اور شکایتوں کی چبھن
لہو کی موج، حنا کی لکیر
سبزے کی ریشمی تحریر
یہ حوصلوں کی توانائیاں
بدن کی تھکن
یہ رتجگوں کا خمار
مشقتوں کے کڑے کوس، راحتوں کے دیار
جنوں کی آگ سے روشن دماغ
ستم کدوں میں یہ جلتے ہوئے سروں کے چراغ
طویل اور گراں لمحے
مختصر صدیاں
خموشیوں کے سمندر،
صداؤں کی ندیاں
مُہیب خطروں کے لشکر
اُمید کے پرچم

کبھی وجود کی لذت
کبھی وجود کا کرب
تمھارے پاس یہ خوشیاں
تمھارے ساتھ یہ غم
خدا کا شکر کرو

دو پھیلے ہوئے ہاتھوں کی دُعا

دو ہاتھ فضا میں اُٹھے ہوئے
سوکھے ہونٹوں سے بہتی ہوئی
دل سوز نواؤں کی گنگا
شوریدہ سروں پر چھائی ہوئی
شبنم سے خنک جذبوں کی ردا
"اے میرے خُدا"
دو پھیلے ہوئے ہاتھوں کی دُعا
سب راہ کے کانٹے چُنتی ہوئی
بادل کی طرح
دشمن سورج کے نیزوں کے سب وار بدن پر سہتی ہوئی
سب سُنتی ہوئی،
سب کہتی ہوئی،
ظالم پتھریلے شہروں کی سفاک ہوا سے لڑتے ہوئے
بوجھل بازو، زخمی ماتھا

دو پھیلے ہوئے ہاتھوں کی دُعا
صحراؤں میں
برکھا سے دُھلے آنگن کی ہوا
دو ہاتھوں کی ٹھنڈک سینے میں
دو ہاتھوں کی نرمی ماتھے پر
ہاتھوں کی سپر
ہاتھوں کے گھنے، دلدار شجر
دو ہاتھ کھلے دروازے پر
رستہ تکتے
خود سر پیروں کے پلٹنے کا
دن ڈھلنے کا،
دکھ کٹنے کا
دو پھیلے ہوئے ہاتھوں کی دُعا
"اے میرے خُدا"

پناہ گاہ

(صبا وحید کے نام)

تو کیا واقعی تم سمجھتے ہو
ہم ذائقے، رنگ، بو، لمس، آواز کی
ہمدگر کاٹتی، ساتھ چلتی اور آپس میں مل کر سسکتی ہوئی
ان گنت ہیئتوں میں بدلتی ہوئی
ان لکیروں کو
اک دوسرے سے الگ کر کے
پہچان سکتے نہیں ؟
اب ذرا اپنا سگریٹ میری طرف بھی بڑھاؤ،
بڑی دیر سے چار مینار کا جان لیوا دھواں
رگ وپے میں چنگاریاں بھر رہا ہے
نہ دو خیر،
لیکن عجب بات ہے،
کہ سگریٹ تم پی رہے ہو مگر
سُرمئی تلخیاں میرے کام و دہن میں اُترتی چلی جا رہی ہیں

○

شکستہ پیرہنوں میں بھی رنگ سا کچھ ہے
ہمارے ساتھ ابھی نام و ننگ سا کچھ ہے

حریف تو مرا انداز ہو چکا کب کا
درونِ ذات مگر محوِ جنگ سا کچھ ہے

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خوفِ ہوس کا ڈھنگ سا کچھ ہے

جو دیکھیے تو نہ تیغِ جفا نہ میرا ہاتھ
جو سوچیے تو کہیں زیرِ سنگ سا کچھ ہے

یار، ادھر اس طرح سے نہ دیکھو
اگر وہ ادھر آ گئی
تو دونوں کا ہیجان سب بھانپ لے گی
تو ثابت ہوا،
ضابطوں اور عقیدوں کے باوصف
تم بھی وہی ہو
جو ہم ہیں
وہی ٹیڑھی میڑھی سی، اقلیدسی خواہشیں
وہی اجنبی اور پُراسرار گہرائیاں
اب تو کمبخت سگریٹ دے دے، بہت مختصر رہ گیا ہے
ترے ہونٹ جلنے لگے ہیں،
سُن رہا ہے!
"وارڈر، وارڈر، اس کو سگریٹ کس نے دیا؟
ہاتھ سے چھین کر پھینک دو"

ایک اُجڑی بستی کا نوحہ

وہ شوخ چشم، مشک بدن کون لے گیا
میرے تتار تیرے ہرن کون لے گیا

صبحِ وطن کے روپ کی لالی کہاں گئی
شامِ وطن کا سانولا پن کون لے گیا

گلیاں خموش، راہ گزاریں اُداس ہیں
کوچہ نوردیوں کی لگن کون لے گیا

اب چاند کوئی بام سے ہوتا نہیں طلوع
غرفوں سے جھانکنے کا چلن کون لے گیا

جلتی دوپہریوں میں نکل کر کدھر کو جاؤں
وہ میرے باغ، وہ مرے بن کون لے گیا

گھر کی فضا میں گرم ہوا کس نے گھول دی
انگنائیوں سے مست پَوَن کون لے گیا

جو روز جھانکتی تھی کواڑوں کی اوٹ سے
اے بند کھڑکیو، وہ کرن کون لے گیا

وہ دل نواز لوگ کہاں جا کے بس گئے
میری رفاقتوں کے چمن کون لے گیا

عارض کی دھوپ، زلف کے سائے کہاں گئے
آنکھوں سے خواب، دل سے جلن کون لے گیا

چہروں سے چاہتوں کی چمک کس نے چھین لی
سینوں سے رنجشوں کی چبھن کون لے گیا

دریائے سوتھ، تیری روانی کدھر گئی
موجِ حریفِ گنگ و جمن کون لے گیا

وہ رتجگوں کے چاہنے والے کہاں گئے
ہنگامہ ہائے شعر و سخن کون لے گیا

جسمِ بُتاں سے کس نے چُرا لی سپردگی
دستِ صنم تراش سے فن کون لے گیا

بدلے میں دے کے مجھ کو یہ انجان صورتیں
میرے رقیب میرے سجن کون لے گیا

کلچر

زنستر ناچ رہے ہیں پیر،
بدن میں جاگ رہے ہیں ناگ
رگوں میں تیر رہے ہیں تیر
سُلگتے سناٹے میں،
رات کو جیسے سَن سَن کرے سمیر
نظر میں ڈنک،
لبوں پہ آگ،
دلوں میں کالے پیلے زہر
مگر سب پوشاکیں بے داغ،
مگر سب مُدرائیں گمبھیر!

اختتامیہ

مجھ کو لکھنا اگر آجائے تو کیا کیا لکھوں
کبھی اپنا کبھی دنیا کا سراپا لکھوں

گم نہ ہو جائے یہ منظر کہیں تعبیروں میں
آنکھ کھل جائے تو اس خواب کا چہرا لکھوں

عرصۂ دہر میں معنی کے سوا کیا ڈھونڈوں
صفحۂ وقت پہ لفظوں کے سوا کیا لکھوں

سب ہی بسمل ہیں مری طرح تو کیا طنز کروں
کوئی قاتل ہو تو میں اس کو مسیحا لکھوں

انگلیاں خامۂ سوزاں کی طرح جلنے لگیں
اس ہتھیلی پہ اگر حرفِ تمنا لکھوں

جو مرا دکھ ہے وہ ہر شخص کا دکھ لگتا ہے
میں کسے غیر کہوں اور کسے اپنا لکھوں

ریت پر دھوپ کوئی عکس تو دکھلائے کہ میں
ایک بوسہ سرِ پیشانیِ صحرا لکھوں

میں وہیں خوش ہوں جہاں تو نے اُگایا ہے مجھے
اب اسی دشت پہ اک پیڑ کا سایا لکھوں

چاک پیراہنِ یوسف تو لکھا ہے سب نے
میں کبھی نارسیِ دستِ زلیخا لکھوں

اس بلکتی ہوئی دھرتی کی بشارت ہے یہی
مسکراتے ہوئے بچّوں کا ہمکنا لکھوں

رخصتی رات کی لکھتا ہوں نہ جانے کب سے
اب نکلتے ہوئے خورشید کا سہرا لکھوں

آگ سوچی ہے تو گلزار بھی تخلیق کروں
زخم لکھّے ہیں تو کچھ ان کا مداوا لکھوں

اے خدا تو مجھے لکھنے کی توانائی دے
اور میں کاغذ پہ ترا نام ہمیشا لکھوں

میں یہ کیوں سوچوں کہ اک موج مٹا دے گی اُسے
ریگِ ساحل پہ کوئی نقشِ کفِ پا لکھوں

اپنے بچّوں کو کوئی تحفہ تو دیتا جاؤں
اپنی آنکھوں میں سمائی ہوئی دنیا لکھوں

وہ میری مصلحتوں کو بگاڑنے والا
ہنوز مجھ میں وہی بے درنگ سا کچھ ہے

چلو زمیں نہ سہی آسمان ہی ہو گا
محبتوں پہ بہرحال تنگ سا کچھ ہے

○

مروّتوں پہ وفا کا گماں بھی رکھتا تھا
وہ آدمی تھا غلط فہمیاں بھی رکھتا تھا

بہت دنوں میں یہ بادل ادھر سے گزرا ہے
مرا مکان کبھی سائباں بھی رکھتا تھا

عجیب شخص تھا، بچتا بھی تھا حوادث سے
پھر اپنے جسم پہ الزامِ جاں بھی رکھتا تھا

ڈبو دیا ہے تو اب اس کا کیا گلہ کیجے
یہی بہاؤ سفینے رواں بھی رکھتا تھا

تو یہ نہ دیکھ کہ سب ٹہنیاں سلامت ہیں
کہ یہ درخت تھا اور پتّیاں بھی رکھتا تھا

ہر ایک ذرّہ تھا گردش میں آسماں کی طرح
میں اپنا پاؤں زمیں پہ جہاں بھی رکھتا تھا

لپٹ بھی جاتا تھا اکثر وہ میرے سینے سے
اور ایک فاصلہ سا درمیاں بھی رکھتا تھا

○

کوئی وحشی چیز سی زنجیرِ پا، جیسے ہوا
دُور تک لیکن سفر کا سلسلا، جیسے ہوا

بند کمرے میں پراگندہ خیالوں کی گھٹن
اور دروازے پہ اک آوازِ پا، جیسے ہوا

گرتی دیواروں کے نیچے سائے، جیسے آدمی
تنگ گلیوں میں فقط عکسِ ہوا، جیسے ہوا

آسماں تا آسماں سنسان سناٹے کی جھیل
دائرہ در دائرہ میری نوا، جیسے ہوا

دو لرزتے ہاتھ جیسے سایہ پھیلائے شجر
کانپتے ہونٹوں پہ اک حرفِ دُعا، جیسے ہوا

پانیوں میں ڈوبتی جیسے رُتوں کی کشتیاں
ساحلوں پر چیختی کوئی صدا، جیسے ہوا

کتنا خالی ہے یہ دامن، جس طرح دامانِ دشت
کچھ نہ کچھ تو دے اسے میرے خدا، جیسے ہوا

○

بہت حسیں تھے ہرن دھیان بٹ گیا آخر
وہی ہوا کہ مرا تیر اُچٹ گیا آخر

ملی نہ جب کوئی راہِ مفر تو کیا کرتا
میں ایک، سب کے مقابل میں ڈٹ گیا آخر

بس اک امید پہ ہم نے گزار دی اک عمر
بس ایک بوند سے کہسار کٹ گیا آخر

بچا رہا تھا میں شہ زور دشمنوں سے اُسے
مگر وہ شخص مجھی سے لپٹ گیا آخر

وہ اُڑتے اُڑتے کہیں دور اُفق میں ڈوب گیا
تو آسمان پروں میں سمٹ گیا آخر

کُھلا کہ وہ بھی کچھ ایسا وَفا پرست نہ تھا
چلو، یہ بوجھ بھی سینے سے ہٹ گیا آخر

ہمارے داغ چھپاتیں روایتیں کب تک
لباس بھی تو پُرانا تھا پھٹ گیا آخر

بڑھا کے ربطِ وفا اجنبی پرندوں سے
وہ ہنس اپنے وطن کو پلٹ گیا آخر

© عرفان صدیقی

سنِ اشاعت: ۱۹۷۸ء
کتابت: ایم۔ آر۔ حسن
طباعت: نامی پریس، لکھنؤ
سرورق: عظمت اللہ خاں
اہتمام: شمس فرخ آبادی

قیمت
پندرہ روپئے
ملنے کے پتے
(۱) مکتبۂ دین و ادب امین الدولہ پارک، امین آباد۔ لکھنؤ
(۲) مرکز ادب اردو، ۳۷ شاہ گنج، لکھنؤ

ادب گھر، سحر منزل، گولہ گنج، لکھنؤ

○

اپنے آنگن ہی میں تھا، راہ گزر میں کیا تھا
ایسا تنہا تھا میں باہر بھی کہ گھر میں کیا تھا

سبز پتّوں نے بہت راز چھپا رکھے تھے
رُت جو بدلی تو یہ جانا کہ شجر میں کیا تھا

تھا کمیں گاہ میں سنّاٹے کا عالم، لیکن
اک نیا رنگ یہ ٹوٹے ہوئے پر میں کیا تھا

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

اور کیا دیکھتی دنیا ترے چہرے کے سوا
کم سے کم رنگ تھا سُرخی میں، خبر میں کیا تھا

تُم یہ دیکھو کہ فقط خاک ہے پیراہن پر
یہ نہ پوچھو کہ مرے رختِ سفر میں کیا تھا

تم بتاتے تو سمجھتی تمھیں دنیا عرفانؔ
فائدہ عرضِ ہُنر میں تھا ہُنر میں کیا تھا

○

کس کو دھوکا یہ ہوا بیتی رُتوں والی دے
آتے موسم کا پتا سوکھی ہوئی ڈالی دے

اے خدا سبزۂ صحرا کو بھی تنہا مت رکھ
اس کو شبنم نہیں دیتا ہے تو پامالی دے

ہر برس صرف سمندر ہی پہ موتی نہ لُٹا
ابرِ نیساں مرے کھیتوں کو بھی ہریالی دے

جب کبھی شام کو تو دستِ دُعا پھیلائے
آسماں کو ترے ہاتھوں کی حِنا لالی دے

چُپ ہوا میں تو بس اقرارِ خطا ہی سمجھو
کیا بیاں اس کے سوا مُجرمِ اقبالی دے

ویسے آنکھیں تو گنہگار بہت ہیں عرفانؔ
آگے جو کچھ مرے جذبوں کی خوش اعمالی دے

کوئلیں پھر بھولے بسرے غم جگانے آ گئیں
گرمیاں لے کر اُداسی کے خزانے آ گئیں

ٹھنڈے دالانوں میں پھر کھلنے لگی دل کی کتاب
جلتی دوپہریں سرا پردے گرانے آ گئیں

ڈھک گئیں پھر صندلیں شاخیں سنہری بور سے
لڑکیاں دھانی دوپٹے سر پہ تانے آ گئیں

پھر دھنک کے رنگ بازاروں میں لہرانے لگے
تتلیاں معصوم بچوں کو رِجھانے آ گئیں

کھل رہے ہوں گے چھتوں پر سانولی شاموں کے بال
کتنی یادیں ہم کو گھر واپس بلانے آ گئیں

دھول سے کب تک کوئی شفاف جذبوں کو بچائے
خواہشوں کی آندھیاں پھر خاک اڑانے آ گئیں

○

خرد کے پاس فرسودہ دلیلوں کے سوا کیا تھا
پُرانے شہر میں ٹوٹی فصیلوں کے سوا کیا تھا

ہوا رستے کی، منظر موسموں کے، سایہ پیڑوں کا
سفر کا ماحصل بے کار میلوں کے سوا کیا تھا

تو وہ شب بھر کی رونق چند خیموں کی بدولت تھی
اب اُس میدان میں سُنسان ٹیلوں کے سوا کیا تھا

پرندوں کی قطاریں اُڑ نہیں جاتیں تو کیا کرتیں
ہماری بستیوں میں خشک جھیلوں کے سوا کیا تھا

تعجب کیا ہے وعدے ہی اگر حصے میں آئے ہیں
مری کوشش کے ہاتھوں میں وسیلوں کے سوا کیا تھا

○

واقعی کیا اُسی قاتل کی طرف تو بھی ہے
تو بھی ہے، اے مری جاں تیغ بکف تو بھی ہے

آسماں اپنی کماں توڑ چکا، یہ نہ سمجھ
اب کوئی تیر جو چھوٹا تو ہدف تو بھی ہے

تیز رفتار ہیں دشمن کے فرس تجھ سے سوا
میرے بعد اے مری بکھری ہوئی صف تو بھی ہے

○

بدل گئی ہے فضا نیلے آسمانوں کی
بہت دنوں میں کھلیں کھڑکیاں مکانوں کی

بس ایک بار جو لنگر اُٹھے تو پھر کیا تھا
ہوائیں تاک میں تھیں جیسے بادبانوں کی

کوئی پہاڑ رُکا ہے کبھی زمیں کے بغیر
ہر ایک بوجھ پہ نہ چاہتا ہے شانوں کی

تو غالباً وہ ہدف ہی حدوں سے باہر تھا
یہ کیسے ٹوٹ گئیں ڈوریاں کمانوں کی

جو ہے وہ کل کے سوالوں کے انتظار میں ہے
یہ زندگی ہے کہ ہے رات امتحانوں کی

ابھی تو سب سے بڑا امتحان بیچ میں ہے
ہمارے جسم جُدا ہیں کہ جان بیچ میں ہے

زمین سخت سہی، آسمان گرم سہی
وہ مطمئن ہے کہ اُس کی اُڑان بیچ میں ہے

یہ شہر پھونکنے والے کسی کے دوست نہیں
کسے خیال کہ تیرا مکان بیچ میں ہے

جدھر بھی جاؤ وہی فاصلوں کی دیواریں
کوئی زمیں ہو وُہی آسمان بیچ میں ہے

رُتوں کے جسم سے کیسے لپٹ سکوں عرفانؔ
مرا بدن ہے کہ اک سائبان بیچ میں ہے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

○

ایک ضد تھی مرا پندارِ وفا کچھ بھی نہ تھا
ورنہ ٹوٹے ہوئے رشتوں میں بچا کچھ بھی نہ تھا

تھا بہت کچھ جو کوئی دیکھنے والا ہوتا
یوں کسی شخص کے چہرے پہ لکھا کچھ بھی نہ تھا

اب بھی چُپ رہتے تو مجرم نظر آتے ورنہ
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں شوقِ نوا کچھ بھی نہ تھا

یاد آتا ہے کئی دوستیوں سے بھی سوا
اک تعلّق جو تکلّف کے سوا کچھ بھی نہ تھا

سب تری دین ہے، یہ رنگ، یہ خوشبو، یہ غُبار
میرے دامن میں تو اے موجِ ہوا کچھ بھی نہ تھا

اور کیا مجھ کو مرے دیس کی دھرتی دیتی
ماں کا سرمایہ بجز حرفِ دُعا کچھ بھی نہ تھا

لوگ خود جان گنوا دینے پہ آمادہ تھے
اس میں تیرا ہنر اے دستِ جفا کچھ بھی نہ تھا

سبز موسم میں ترا کیا تھا ہوا نے پوچھا
اُڑ کے سوکھے ہوئے پتّے نے کہا کچھ بھی نہ تھا

○

خوشبو کی طرح ساتھ لگا لے گئی ہم کو
کوچے سے ترے بادِ صبا لے گئی ہم کو

پتھر تھے کہ گوہر تھے، اب اس بات کا کیا ذکر
اک موج بہر حال بہا لے گئی ہم کو

پھر چھوڑ دیا ریگِ سرِ راہ سمجھ کر
کچھ دور تو موسم کی ہوا لے گئی ہم کو

تم کیسے گرے آندھی میں چھتنار درختو؟
ہم لوگ تو پتے تھے، اُڑا لے گئی ہم کو

ہم کون شناور تھے کہ یوں پار اُترتے
سوکھے ہوئے ہونٹوں کی دُعا لے گئی ہم کو

اس شہر میں غارت گرِ ایماں تو بہت تھے
کچھ گھر کی شرافت ہی بچا لے گئی ہم کو

○

ذہن ہو تنگ تو پھر شوخیِ افکار نہ رکھ
بند تہہ خانوں میں یہ دولتِ بیدار نہ رکھ

زخم کھانا ہی جو ٹھہرا تو بدن تیرا ہے
خوف کا نام مگر لذتِ آزار نہ رکھ

ایک ہی چیز کو رہنا ہے سلامت، پیارے
اب جو سر شانوں پہ رکھا ہے تو دیوار نہ رکھ

خواہشیں توڑ نہ ڈالیں ترے سینے کا قفس
اتنے شہ زور پرندوں کو گرفتار نہ رکھ

اب میں چُپ ہوں تو مجھے اپنی دلیلوں سے نہ کاٹ
میری ٹوٹی ہوئی تلوار پہ تلوار نہ رکھ

آج سے دل بھی ترے حال میں ہوتا ہے شریک
لے، یہ حسرت بھی مری چشمِ گنہگار نہ رکھ

وقت پھر جانے کہاں اُس سے ملا دے تجھ کو
اس قدر ترکِ ملاقات کا پندار نہ رکھ

○

کس کو دیں قتل کا الزام، بڑی مشکل ہے
جو بھی قاتل ہے ہماری ہی طرح بسمل ہے

تیز دھاروں نے حدیں توڑ کے رکھ دیں ساری
اب یہ عالم کہ جو دریا ہے وہی ساحل ہے

جو اکیلے میں جلوسوں کا اُڑاتا ہے مذاق
وہ بھی اس بھیڑ میں اوروں کی طرح شامل ہے

اتنی اُمید نہ آتے ہوئے برسوں سے لگاؤ
حال بھی تو کسی ماضی ہی کا مستقبل ہے

شوق دونوں کو ہے ملنے کا، مگر رستے میں
ایک پندار کی دیوارِ گراں حائل ہے

زہرۂ فکر کم آمیز بہت ہے، عرفاںؔ
کم سے کم اس کا تعارف تو تمھیں حاصل ہے

○

میں تو اک بادل کا ٹکڑا ہوں، اُڑا لے چل مجھے
تو جہاں چاہے وہاں موجِ ہوا لے چل مجھے

خود ہی نیلے پانیوں میں پھر بُلا لے گا کوئی
ساحلوں کی ریت تک اے نقشِ پا لے چل مجھے

تجھ کو اس سے کیا میں امرت ہوں کہ اک پانی کی بوند
چارہ گر، سُوکھی زبانوں تک ذرا لے چل مجھے

کب تک ان سڑکوں پہ بھٹکوں گا بگولوں کی طرح
میں بھی کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں صبا لے چل مجھے

اجنبی رستوں میں آخر دھول ہی دیتی ہے ساتھ
جانے والے اپنے دامن سے لگا لے چل مجھے

بند ہیں اس شہرِ نا پُرساں کے دروازے تمام
اب مرے گھر اے مری ماں کی دُعا لے چل مجھے

شبّی کے نام

○

ٹھنڈی گلیوں میں چمکیلی دھوپ
نیلا موسم، پیلی پیلی دھوپ

آنسو ٹپکے، بھیگ گئے رخسار
بادل برسے، ہو گئی گیلی دھوپ

دلکش لہجے، ٹھنڈے رسمی بول
سُرخ مکانوں پر برفیلی دھوپ

بڑھتے ہوئے دشمن جیسی دوپہر
نیزوں جیسی تیز نکیلی دھوپ

اُجلی برف پہ کھیلے گوری صُبح
گہری جھیل میں تیرے نیلی دھوپ

سیج پہ لیٹی شوخ، سلونی شام
بدن چُرائے گئی لجیلی دھوپ

○

وہ اُن دنوں تو ہمارا تھا لیکن اب کیا ہے
پھر اُس سے آج وہی ربطِ بے سبب کیا ہے

تم اُس کا وار بچانے کی فکر میں کیوں ہو
وہ جانتا ہے مسیحائیوں کا ڈھب کیا ہے

دبیز کُہر ہے یا نرم دھوپ کی چادر
خبر نہیں ترے بعد اے غبارِ شب کیا ہے

دکھا رہا ہے کسے وقت آن گنت منظر
اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے

اب اس قدر بھی سکوں مت دکھا بچھڑتے ہوئے
وہ پھر تجھے نہ کبھی مل سکے عجب کیا ہے

میں اپنے چہرے سے کس طرح یہ نقاب اُٹھاؤں
سمجھ بھی جا کہ پسِ پردہ طرب کیا ہے

یہاں نہیں ہے یہ دستورِ گفتگو، عرفان
فغاں سُنے نہ کوئی حرفِ زیرِ لب کیا ہے

○

کسی نے دیکھا ہے کل کی ضرورتوں کو ابھی
بچائے رکھو پرانی روایتوں کو ابھی

جو لوگ کرتے ہیں بے داغ چاہتوں کی تلاش
ترسنے والے ہیں جھوٹی محبتوں کو ابھی

پھر اک کمند نے ماں سے چھڑا لیا اس کو
سمجھ رہا تھا وہ صحرا کی وسعتوں کو ابھی

اکھڑ رہا ہے بھری دوپہر کا سناٹا
شریر پاؤں میسّر نہیں چھتوں کو ابھی

سُنا یہ ہے وہ بہت خوش سمجھ رہا ہے ہمیں
تو اس نے دُور سے دیکھا ہے شہرتوں کو ابھی

زمانہ کل انھیں سچائیاں سمجھ لے گا
تم اک مذاق سمجھتے ہو تہمتوں کو ابھی

○

جُھلس رہے ہیں کڑی دھوپ میں شجر میرے
برس رہا ہے کہاں ابرِ بے خبر میرے

گرا تو کوئی جزیرہ نہ تھا سمندر میں
کہ پانیوں پہ کھُلے بھی بہت تھے پر میرے

اب اس کے بعد گھنے جنگلوں کی منزل ہے
یہ وقت ہے کہ پلٹ جائیں ہمسفر میرے

خبر نہیں ہے مرے گھر نہ آنے والے کو
کہ اُس کے قد سے تو اونچے ہیں بام و در میرے

بہت ہے آئنے جن قیمتوں پہ بک جائیں
یہ پتّھروں کا زمانہ ہے، شیشہ گر میرے

حریفِ تیغِ ستم گر تو کر دیا ہے تجھے
اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میرے

○

قدم اٹھے تو گلی سے گلی نکلتی رہی
نظر دیئے کی طرح چوکھٹوں پہ جلتی رہی

کچھ ایسی تیز نہ تھی اس کے انتظار کی آنچ
یہ زندگی ہی مری برف تھی پگھلتی رہی

سروں کے پھول سرِ نوکِ نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

ہتھیلیوں نے بچایا بہت چراغوں کو
مگر ہوا ہی عجب زاویئے بدلتی رہی

دیارِ دل میں کبھی صبح کا گجر نہ بجا
بس ایک درد کی شب ساری عمر ڈھلتی رہی

میں اپنے وقت سے آگے نکل گیا ہوتا
مگر زمیں بھی مرے ساتھ ساتھ چلتی رہی

۵

میں یہ کیوں سوچوں کہ اک موج مٹا دے گی اُسے
ریگِ ساحل پہ کوئی نقشِ کفِ پا لکھوں

○

ہر سمت آرزوؤں کے لاشے پڑے ہوئے
کس دشت میں ہیں شوق کے گھوڑے اڑے ہوئے

معصوم چہرہ، تیز نگاہوں کی زد میں ہے
نیزے ہیں نرم کھیت کے دل میں گڑے ہوئے

ہم بیچنے کو لائے ہیں ماضی کے پیرہن
کہنہ روایتوں کے نگینے جڑے ہوئے

اپنے لیے تو ہار ہے کوئی، نہ جیت ہے
ہم سب ہیں دوسروں کی لڑائی لڑے ہوئے

ان کو خبر نہیں کہ ہے پانی کا کیا مزاج
جو پیڑ ہیں ندی کے کنارے کھڑے ہوئے

○

تو اس کا دھیان مرے مصرعِ حسیں پہ نہیں
شکن ابھی کوئی ابروئے نکتہ چیں پہ نہیں

مکان چھوڑ گئے لوگ ڈھونڈتے ہو کسے
کوئی ستارہ اب اس بامِ انجمیں پہ نہیں

بہت ملی تھیں دعائیں فلک نشینی کی
ہمارا کچھ بھی بدن کے سوا زمیں پہ نہیں

اب ایسے شخص کو قاتل کہیں تو کیسے کہیں
لہو کا کوئی نشاں اُس کی آستیں پہ نہیں

اُداس خشک لبوں پر لرز رہا ہو گا
وہ ایک بوسہ جواب تک مری جبیں پہ نہیں

میں جل رہا ہوں حقیقت کی دھوپ میں کب سے
کسی گماں کا بھی سایہ مرے یقیں پہ نہیں

○

مری طرف تری موجِ نوا چلی ہی نہیں
ہوا کبھی سرِ دشتِ بلا چلی ہی نہیں

تمام فیصلے بس ایک شخص کرتا تھا
وہاں یہ بحثِ خطا و سزا چلی ہی نہیں

دل و زباں میں کبھی جیسے رابطہ ہی نہ تھا
اُٹھے بھی ہاتھ تو رسمِ دُعا چلی ہی نہیں

یہ مت سمجھ کہ ترے قتل کا خیال نہ تھا
نکل چکی تھی مگر بے وفا چلی ہی نہیں

میں چاہتا تھا کہ کچھ سرکشی کی داد ملے
تو اب کے شہر میں تیغِ جفا چلی ہی نہیں

بہت خراب تھی شعلہ گروں کی قسمت بھی
مکان اور بھی جلتے ہوا چلی ہی نہیں

○

گھُلا تصویر میں رنگِ حِنا آہستہ آہستہ
بڑھی سر کی طرف تیغِ جفا آہستہ آہستہ

تم اپنی مملکت میں جُرم کردو زندگی، ورنہ
سبھی مانگیں گے اپنا خوں بہا آہستہ آہستہ

مجھے اوروں کے سے انداز آتے آتے آئیں گے
کہ پتّھر بن سکے گا آئنا آہستہ آہستہ

ہُوا آخر وہ ہم سے ہم سخن، قدرے تکلّف سے
چلی صحرا میں بھی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ

بگولے یک بیک اُن سونے والوں کو جگاتے ہیں
سُلاتی ہے جنھیں بادِ صبا، آہستہ آہستہ

ہمیں دُنیا جو دے گی ہم وہی لوٹائیں گے اس کو
گنہ بن جائے گی رسمِ وفا آہستہ آہستہ

اچانک دوستو میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا
یہاں ہوتا ہے ہر اک حادثا آہستہ آہستہ

○

کاش میں بھی کبھی یاروں کا کہا مان سکوں
آنکھ کے جسم پہ خوابوں کی ردا تان سکوں

میں سمندر ہوں، نہ تو میرا شناور، پیارے
تو بیاباں ہے نہ میں خاک تری چھان سکوں

روئے دلبر بھی وہی، چہرۂ قاتل بھی وہی
تو کبھی آنکھ ملائے تو میں پہچان سکوں

وقت یہ اور ہے، مجھ میں یہ کہاں تاب کہ میں
یاریاں جھیل سکوں، دشمنیاں ٹھان سکوں

جب ستم ہے یہ تعارف ہی تو کیسا ہو، اگر
میں اُسے جاننے والوں کی طرح جان سکوں

○

مجھے اُلجھا دیا دانش کدوں نے صرف خوابوں میں
کوئی تعبیر رکھ دو میرے بچوں کی کتابوں میں

طلسم ایسا تو ہو جو خوبصورت ہو حقیقت سے
ہنر یہ بھی نہیں ہے آج کے افراسیابوں میں

تعلّق اک تعارف تک سمٹ کر رہ گیا آخر
نہ وہ تیزی سوالوں میں نہ وہ تلخی جوابوں میں

مکاں کیسے بھی ہوں، خوابوں کی خاطر کون ڈھاتا ہے
کم از کم اس قدر ہمّت تو تھی خانہ خرابوں میں

ذرا سوچو تو اس دنیا میں شاید کچھ نہیں بدلا
وہی کانٹے ببولوں میں، وہی خوشبو گلابوں میں

○

اپنے بھولے ہوئے منظر کی طرف لوٹ چلو
گم شدہ تیرو، کسی سر کی طرف لوٹ چلو

تم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہو آزاد
شام ہونے کو ہے، اب گھر کی طرف لوٹ چلو

اس سے بچھڑے تو تمھیں کوئی نہ پہچانے گا
تم تو پرچھائیں ہو پیکر کی طرف لوٹ چلو

ریت کی ہمسفری صرف کناروں تک ہے
اجنبی موجو، سمندر کی طرف لوٹ چلو

کتنے بے مہر ہیں اس شہر کے قاتل، عرفان
پھر اُسی کوچۂ دلبر کی طرف لوٹ چلو

ابتدائیہ

سفر کی زنجیر

"شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں"

جلتی دوپہر میں پیڑی کا پُراسرار درخت
جس سے لپٹا ہوا گزری ہوئی صدیوں کا طلسم
پھلوئے خاک میں آسودہ کوئی مردِ شہید
(ذہن میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا گونجتی ہے)
جاودانہ تب و تاب اور قبا خون سے تر
وہ تو زندہ ہیں مگر تم کو نہیں اس کی خبر
پیڑیاں فرش پہ بکھری ہوئی پھولوں کی طرح
اور جاروب کشی کرتی ہوئی موجِ ہوا
طاق میں رات کے افسردہ چراغوں کا دھواں
یہ گلی گنج شہیداں کی طرف جاتی ہے
"تم کبھی شب میں اُدھر سے نہ گزرنا کہ وہاں
صف بہ صف تند فرس، سبز علم اُڑتے ہیں"
مصحفی نے جو کہا ہے تمھیں معلوم نہیں؟
سُرمۂ چشم ہے یہ خاک تو خسرو کے لیے
پیڑیاں چنتے ہوئے دیر ہوئی، گھر کو چلو

سمٹتی دھوپ تحریرِ حنا سی ہوتی جاتی ہے
سلونی شام جیسے خوں کی پیاسی ہوتی جاتی ہے

تھکے ہونٹوں سے بوسوں کے پرندے اُڑتے جاتے ہیں
ہوس جاڑے کی شاموں کی اُداسی ہوتی جاتی ہے

سکوتِ شب میں تم آواز کا شیشہ گرا دینا
فضا سنسان کمرے کی نند اسی ہوتی جاتی ہے

کوئی رکھ دے کسی الزام کا تازہ گلاب اس میں
بچھڑتی چاہتوں کی گود باسی ہوتی جاتی ہے

تو پھر اک بار یہ چاکِ گریباں سب کو دکھلا دیں
بہت بدنام اپنی خوش لباسی ہوتی جاتی ہے

غزل کی صحبتوں سے اور کچھ حاصل نہیں، لیکن
غزالوں سے ذرا صورت شناسی ہوتی جاتی ہے

○

ایک اور دن شہید ہوا، ہو گئی ہے شام
لشکر سے شب کے شور اٹھا، ہو گئی ہے شام

مدّت ہوئی کہ سر پہ سرابوں کی دھوپ ہے
دشتِ طلب میں ہم سے خفا ہو گئی ہے شام

لَو دے اُٹھا ہے دستِ دُعا پر شفق کا رنگ
تیری ہتھیلیوں پہ حنا ہو گئی ہے شام

میرے لبوں سے مل کے الگ کیا ہوئی وہ زلف
جلتی دوپہریوں سے جدا ہو گئی ہے شام

عارض کی دھوپ زلف کے سائے بدن کی آنچ
ہنگامہ بن کے دل میں بپا ہو گئی ہے شام

غربت کی دھوپ کیسے کسی کو دکھائی دے
میرے برہنہ سر کی ردا ہو گئی ہے شام

سورج کا خون بہنے لگا پھر ترائی میں
پھر دستِ شب میں تیغِ جفا ہو گئی ہے شام

کہیں تو لُٹنا ہے پھر نقدِ جاں بچانا کیا
اب آ گئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا

ان آندھیوں میں بھلا کون اِدھر سے گزرے گا
دریچے کھولنا کیسا، دیئے جلانا کیا

جو تیر بوڑھوں کی فریاد تک نہیں سُنتے
تو اُن کے سامنے بچّوں کا مُسکرانا کیا

میں گر گیا ہوں تو اب سینے سے اُتر آؤ
دلیر دشمنو، ٹوٹے مکاں کو ڈھانا کیا

نئی زمیں کی ہوائیں بھی جان لیوا ہیں
نہ لَوٹنے کے لیے کشتیاں جلانا کیا

کنارِ آب کھڑی کھیتیاں یہ سوچتی ہیں
وہ نرم رَو ہے ندی کا مگر ٹھکانا کیا

پھر جگاتی ہے وہی ٹیس پُرانی، بارش
اِس برس بھی ہے اُسی طرح سُہانی، بارش

سِسکیاں بھرتی رہی رات ہوا آنگن میں
رات بھر کہتی رہی کوئی کہانی بارش

آگ بن کر کبھی شریانوں میں بہتا ہوا خون
کبھی آنکھوں سے برستا ہوا پانی بارش

اب تو یہ پیڑ ٹپکتا ہے مری چھت کی طرح
دو گھڑی روک ذرا اپنی روانی بارش

سبز پانی نے بدل ڈالا ہے منظر کا طلسم
رنگ کوئی ہو، کیے دیتی ہے دھانی، بارش

چاہنے والی، مرے درد جگانے والی
میری محبوب، مری دشمنِ جانی، بارش

○

اس تکلّف سے نہ پوشاکِ بدن گیر میں آ
خواب کی طرح کبھی خواب کی تعبیر میں آ

میں بھی اے سُرخیِ بے نام تجھے پہچانوں
تو حنا ہے کہ لہو، پیکرِ تصویر میں آ

اس کے حلقے میں تگ و تاز کی وسعت ہے بہت
آ ہوئے شہر، مری باہوں کی زنجیر میں آ

چارہ گر نیم سے خوش ذوق ہے اے میری غزل
کام اب تو ہی مرے درد کی تشہیر میں آ

وہ بھی آمادہ بہت دن سے ہے سُننے کے لیے
اب تو اے حرفِ طلب معرضِ تقریر میں آ

ایک رنگ آخری منظر کی دھنک میں کم ہے
موجِ خوں اُٹھ کے ذرا عرصۂ شمشیر میں آ

ہم سے اگلوں نے بہت شہر کیے ہیں آباد
قافلے کتنے ہی قریوں سے اِدھر آئے ہیں
بلخ، کرمان، یمن، سبز، بخارا، فرشور
(راہداری پہ کوئی روک نہیں تھی اُس وقت)
ایل ویلدوز تو خیاط و رسن تاب کہیں
چترو اورنگ کہیں، منبر و محراب کہیں
دیکھنا، جامعِ شمسی میں ستوں ہیں کتنے
(ایک ہی ذوق ہے آسین سے دو آبے تک)
معرکے، رزم گہیں، کشف، کرامات، سلوک
مدرسے، خانقہیں، جذب، مقامات، سماع
"یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز"
"درگہ شاہِ ولایت میں جو اک زینہ ہے
تم وہاں جا کے پکارو کسی گم گشتہ کو
سالہا سال کے کھوئے ہوئے لوٹ آتے ہیں
شرط یہ ہے کہ صداؤں کا جواب آجائے"
(اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کو پکاریں جا کر)
سوکھ کے دونوں طرف زرد کھجوروں کی قطار
تعزیے دفن کیے جاتے ہیں ریتی کے قریب
آگے سوردوں ہے جہاں رام چرت لکھی گئی
اور گنگا کے ادھر قصبۂ پٹیالی ہے
ہم اِسی مٹّی سے اُگنے کے لیے آئے تھے

○

ہائے وہ جسم کہ اک جی کی جلن وہ بھی ہے
اور سچ پوچھو تو سرمایۂ فن وہ بھی ہے

اس کو باہنوں میں گرفتار کرو تو جانیں
تم شکاری ہو تو رم خوردہ ہرن وہ بھی ہے

ایک دن تو بھی مری فکر کے تاتار میں آ
تیرا گھر اے مرے آہوئے ختن، وہ بھی ہے

اس کی آنکھوں میں بھی رقصاں ہے وہی گرمیِ شوق
غالباً محرمِ اسرارِ بدن وہ بھی ہے

لاؤ کچھ دیر کو پہلوئے بتاں میں رک جائیں
ہم مسافر ہیں، ہمارا تو وطن وہ بھی ہے

اور کچھ راز نہیں راتوں کی بیداری کا
ہم بھی ہیں شیفتۂ شعر و سخن وہ بھی ہے

○

لہو رکاب پہ ہے اور شکار زین میں ہے
مگر کمند ابھی دستِ سُبکتگین میں ہے

اُسے بھی فکر ہے اسٹیج تک، پہنچنے کی
جو شخص ابھی صفِ آخر کے حاضرین میں ہے

جو دیکھ لے وہ برہنہ دکھائی دینے لگے
عجیب طرح کی تصویر میگزین میں ہے

فقط یہ بڑھتا ہوا دستِ دوستی ہی نہیں
ہمیں قبول ہے وہ بھی جو آستین میں ہے

مٹھائیوں میں ملی کرکراہٹیں جیسے
گُماں کی طرح کوئی شے مرے یقین میں ہے

نمو پذیر ہوں میں اپنی فکر کی مانند
مرا وجود مرے ذہن کی زمین میں ہے

○

چراغ دینے لگے گا دھواں، نہ چھو لینا
تو میرا جسم کہیں میری جاں نہ چھو لینا

زمیں چھٹی تو بھٹک جاؤ گے خلاؤں میں
تم اُڑتے اُڑتے کہیں آسماں نہ چھو لینا

نہیں تو برف سا پانی تمھیں جلا دے گا
گلاس لیتے ہوئے انگلیاں نہ چھو لینا

ہمارے لہجے کی شائستگی کے دھوکے میں
ہماری باتوں کی گہرائیاں نہ چھو لینا

اُڑے تو پھر نہ ملیں گے رفاقتوں کے پرند
شکایتوں سے بھری ٹہنیاں نہ چھو لینا

مروّتوں کو محبّت نہ جاننا، عرفانؔ
تم اپنے سینے سے نوکِ سناں نہ چھو لینا

○

شکوہ کوئی بھی نہ دستِ ستم ایجاد سے ہے
ہم کو جو رنج ہے وہ جرأتِ فریاد سے ہے

داستانوں میں تو ہم نے بھی پڑھا ہے، لیکن
آدمی کا بھی کوئی رشتہ پری زاد سے ہے!

زندہ ہے ذہن میں گزرے ہوئے لمحوں کی مہک
دشت آباد بہت، نکہتِ برباد سے ہے

سچ تو یہ ہے کہ تری نوک پلک کا رشتہ
آخرِ کار ترے حُسنِ خداداد سے ہے

اس بلندی سے تجھے چاہے میں دکھلائی نہ دوں
پھر بھی کچھ ربط تو دیوار کا بنیاد سے ہے

زہر کا جام ہو یا منبرِ دانش، عرفانؔ
ابنِ آدم کا جو ورثہ ہے وہ اجداد سے ہے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

○

ہر اک تصویر کو کھڑکی سے باہر کیسے پھینکو گے
نگاہوں سے جو چپکے ہیں وہ منظر کیسے پھینکو گے

جھٹک کر پھینک دو گے چند اَن چاہے خیالوں کو
مگر کاندھوں پہ یہ رکھّا ہوا سر کیسے پھینکو گے

اگر اتنا ڈرو گے اپنے سر پہ چوٹ لگنے سے
تو پھر تم آم کے پیڑوں پہ پتھّر کیسے پھینکو گے

خیالوں کو بیاں کے دائروں میں لاؤ گے کیونکر
کمندیں بھاگتی پرچھائیوں پر کیسے پھینکو گے

آسمانوں میں جو دن رات یہ اُڑتے ہیں جہاز
اتحادی ہیں کہ نازی ہیں کہ فسطائی ہیں
دور میدانوں میں چیلوں کی ضیافت ہوگی
کچھ عجب چیز ہے جوہر کی توانائی بھی
ایک ہی وار میں جی چھوٹ گیا ٹوجو کا
آج رومیل کو آقا نے بلایا ہے وہاں
آلِ یعقوب پہ یہ رات بہت بھاری ہے
ارضِ موعود کہاں، گریہ کرو، گریہ کرو
(اور مظلوم، ستم پیشہ بھی ہو جاتے ہیں)
ان کا وعدہ ہے کہ اس معرکۂ سخت کے بعد
ہم تمھاری یہ امانت تمھیں لوٹا دیں گے
جن کی اقلیم پہ سورج نہیں ہوتا تھا غروب
کھولتے پھرتے ہیں خیموں کی طنابیں ہر سمت
آگ دہلیز تک آ پہنچی ہے، رفتہ رفتہ
(آج بلفاسٹ میں پھر ہو گیا ہنگامہ بپا)
پھول کا تازہ شمارہ نہیں آیا اب تک
تاج صاحب کی کہانی تو بہت اچھی تھی
"اب کے ہم لوگ بھی جائیں گے بنارس، ابا
تازہ ہولوں کا مزہ اور ہی کچھ ہوتا ہے"
بار نبلیٹ کو کل دے گی وداعی دعوت
"شیروانی پہ برش کر کے مجھے دے جاؤ"
"کیا مشن کے نئے فادر بھی چلے جائیں گے؟"

کبھی سچّائیوں کی دھوپ میں بیٹھے نہیں اب تک
تم اپنے سر سے یہ خوابوں کی چادر کیسے پھینکو گے

تو پھر کیوں اس کو آنکھوں میں سجا کر رکھ نہیں لیتے
تم اس بیکار دنیا کو اُٹھا کر کیسے پھینکو گے

○

نرم جھونکے سے یہ اک زخم سا کیا لگتا ہے
اے ہوا، کچھ ترے دامن میں چھپا لگتا ہے

ہٹ کے دیکھیں گے اُسے رونقِ محفل سے کبھی
سبز موسم میں تو ہر پیڑ ہرا لگتا ہے

وہ کوئی اور ہے جو پیاس بجھاتا ہے مری
ابر پھیلا ہوا دامانِ دُعا لگتا ہے

اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

ایسی بے رنگ بھی شاید نہ ہو کل کی دُنیا
پھول سے بچوں کے چہروں سے پتا لگتا ہے

دیکھنے والو، مجھے اس سے الگ مت جانو
یوں تو ہر سایہ ہی پیکر سے جُدا لگتا ہے

زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹی
جیسے اک خیمہ سرِ دشتِ بلا لگتا ہے

○

جنگلوں میں شہر در آئے ہیں خوش حالی لیے
پیڑ گملوں میں سمٹ جائیں گے ہریالی لیے

میری دھرتی جس پہ برسوں سے گھٹا برسی نہیں
آسماں کو تک رہی ہے کاسۂ خالی لیے

ذہن پر اندیشے اُولوں کی طرح گرتے ہوئے
آرزوئیں کھیت کے سبزے کی پامالی لیے

بستیوں پر روشنی کے چند سکّے پھینک کر
ایک بادل جا رہا ہے چاند کی تھالی لیے

شاعروں کو روز البیلے خیالوں کی تلاش
جیسے بچے تتلیوں کی کھوج میں جالی لیے

میں اس کی آنکھوں کا اک خواب تھا، مگر اک رات
وہ کچی نیند کی صورت مجھے اُچاٹ گیا

سنا تھا میں نے کہ فطرت خلاء کی دشمن ہے
سو وہ بدن مری تنہائیوں کو پاٹ گیا

مرے گماں نے مرے سب یقیں جلا ڈالے
ذرا سا شعا بھری بستیوں کو چاٹ گیا

لچک کے ملنا تھا اس تیز دھار سے عرفانؔ
تنے ہوئے تھے تو یہ وار تم کو کاٹ گیا

○

ہم سوکھے ہوئے پیڑوں کو بیکار بچائیں
اُٹھتے ہوئے تیشوں سے کہو دھار بچائیں

شاید کہ اتر آئے سوا نیزے پہ سورج
کل کے لیے کچھ سایۂ دیوار بچائیں

خنجر کی طرح کاٹ بھی ہے تُند ہوا میں
اب سر کی کریں فکر کہ دستار بچائیں

نفرت کے خزانے میں تو کچھ بھی نہیں باقی
تھوڑا سا گزارے کے لیے پیار بچائیں

اولوں کی طرح ہم پہ برستا رہے موسم
ہم جھومتی شاخوں کی طرح وار بچائیں

○

ہم سے رخصت ہمیں ہونے نہیں دیتا کوئی
شہر کی بھیڑ میں کھونے نہیں دیتا کوئی

ہر طرف پرسشِ غم، پرسشِ غم، پرسشِ غم
چین سے بوجھ بھی ڈھونے نہیں دیتا کوئی

لوگ دریا میں اترنے سے ڈراتے ہیں بہت
جسم پانی میں ڈبونے نہیں دیتا کوئی

یہ گزرگاہ کا سناٹا یہ پُرشور ہوا
کھڑکیاں کھول کے سونے نہیں دیتا کوئی

باغ میں سبزۂ شاداب بہت ہے لیکن
اوس سے پاؤں بھگونے نہیں دیتا کوئی

○

سوچتا ہوں کہ محفوظ کر لوں اُسے اپنے سینے میں لفظ و بیاں کی طرح
تھوڑی ہی دیر میں یہ ملاقات بھی ختم ہو جائے گی داستاں کی طرح

یہ رفاقت بہت مختصر ہے مری ہمسفر لا مرے ہاتھ میں ہاتھ دے
تو ہوائے سرِ رہ گزر کی طرح، میں کسی نکہتِ رائگاں کی طرح

حال ظالم شکاری کی صورت مجھے وقت کی زین سے باندھ کر لے چلا
میرا ماضی مرے ساتھ چلتا رہا دور تک ایک مجبور ماں کی طرح

سنگِ آزار کی بارشیں تیز تھیں اور بچنے کا کوئی طریقہ نہ تھا
رفتہ رفتہ سبھی نے سروں پر کوئی بے حسی تان لی سائباں کی طرح

خواہشوں کے سمندر سے اک موج اٹھی اور سیلِ بلاخیز بنتی گئی
جسم کشتی کی مانند اُلٹنے لگے، پیرہن اُڑ گئے بادباں کی طرح

○

اس ایک شخص کو مجھ سے حجاب کتنا ہے
پڑھا ہوا وہ دلوں کی کتاب کتنا ہے

حقیقتیں بھی سُہانی دکھائی دیتی ہیں
بسا ہوا مری آنکھوں میں خواب کتنا ہے

وہ مل گیا ہے مگر جانے کب بچھڑ جائے
سکوں بہت ہے مگر اضطراب کتنا ہے

نہ ہوگا کیا کبھی اس کے بدن کا چاند طلوع
لہو میں اترا ہوا آفتاب کتنا ہے

صدائیں اس کی دلوں میں اترتی جاتی ہیں
گدائے شہرِ سخن باریاب کتنا ہے

○

ہر چند میں قسمت کا سکندر تو نہیں تھا
وہ شخص بھی انسان تھا، پتھر تو نہیں تھا

یہ خون میں اک لہر سی کیا دوڑ رہی ہے
سایہ جسے سمجھے تھے، وہ پیکر تو نہیں تھا

آنکھوں میں ہیں گزری ہوئی راتوں کے خزانے
پہلو میں وہ سرمایۂ بستر تو نہیں تھا

اتنا بھی نہ کر طنز، تنک ظرفیِ دل پر
قطرہ تھا، بہر حال سمندر تو نہیں تھا

(وہ تو بیچارے کسی کو بھی نہیں مارتے ہیں)
گھوش نے آج کے اخبار میں کیا لکھا ہے؟

پیٹر دو حصوں میں بٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟
جشنِ آزادیِ جمہور منانے کے لئے
کل سے اسکول میں تعطیل رہے گی، بچّو
(ڈور جب بیچ سے کٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟)
ہم بھی کل شام کی گاڑی سے چلے جائیں گے
آج ہی پاپا کا لاہور سے خط آیا ہے
ہم یہی بیل وہاں لان میں لگوائیں گے
قافلے سینۂ گیتی پہ رواں ہیں کہ جو تھے
اے زمیں، میری زمیں، اُس کی زمیں، سب کی زمیں!

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا
شعر میں کون سی تلمیح ہے تشریح کرو
نظم کی شرح اٹھاؤ مری الماری سے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے
بوالحسن جاگا تو پھر اپنے ہی گھر میں جاگا
کیوں گلیور کو کوئی اپنے برابر نہ ملا
مسئلہ شکلِ عروسی کا بہت مشکل ہے
ایکس کیوں سب سے یہ کہتا ہے کہ ڈھونڈو مجھ کو

غزلوں میں تو یوں کہنے کا دستور ہے، ورنہ
سچ مچ مرا محبوب ستم گر تو نہیں تھا

یہ زخم دکھاتے ہوئے کیا پھرتے ہو عرفانؔ
اک لفظ تھا پیارے، کوئی نشتر تو نہیں تھا

○

قرض دم توڑتے جذبوں کا اُتارو، یارو
لفظ برچھی ہے اگر تاک کے مارو، یارو

دور ہی دور سے آواز نہ دے کر رہ جاؤ
بڑھتے ہاتھوں سے بھی یاروں کو پکارو، یارو

اِس ستارے سے اُدھر بھی بہت آبادی ہے
اپنے باہر بھی ذرا وقت گزارو، یارو

سروِ قامت نہ سہی، سنگِ ملامت ہی سہی
سر ملا ہے تو کسی چیز پہ وارو، یارو

لوگ اُتنے ہی وفادار ہیں جتنے تم ہو
تم نہ جیتو کبھی یہ کھیل، نہ ہارو، یارو

○

نہ جانے اتنے وفا ناشناس کیسے ہوئے
تمہارے ہوتے ہوئے ہم اُداس کیسے ہوئے

جو خواب میں نظر آتے تو چونک جاتا تھا
وہ حادثے مری آنکھوں کو راس کیسے ہوئے

دلوں میں اب وہ پرانی کدورتیں بھی نہیں
یہ سایہ دار شجر بے لباس کیسے ہوئے

یہ نرم لہجہ تمہارا چلن نہ تھا، عرفان
تم آج ایسے زمانہ شناس کیسے ہوئے

○

ہم سے شاید ہی کبھی اس کی شناسائی ہو
دل یہ چاہے ہے کہ شہرت ہو نہ رسوائی ہو

وہ تھکن ہے کہ بدن ریت کی دیوار سا ہے
دشمنِ جاں ہے، وہ پچھوا ہو کہ پُروائی ہو

ہم وہاں کیا نگہِ شوق کو شرمندہ کریں
شہر کا شہر جہاں اُس کا تماشائی ہو

درد کیسا جو ڈبوئے نہ بہالے جائے
کیا ندی جس میں روانی ہو نہ گہرائی ہو

کچھ تو ہو جو تجھے ممتاز کرے اوروں سے
جان لینے کا ہنر ہو کہ مسیحائی ہو

تم سمجھتے ہو جسے سنگِ ملامت عرفانؔ
کیا خبر وہ بھی کوئی رسمِ پذیرائی ہو

○

یورشِ جلوہ ہے آنکھوں کے گنہگاروں پر
ہے ستم گرمیِ بازار خریداروں پر

روپ کی دھوپ کہاں جاتی ہے معلوم نہیں
شام کس طرح اُتر آتی ہے رخساروں پر

تو ہی بول، اے مرے بے جُرم لہو کی تحریر
کوئی دھبّہ نہیں چلتی ہوئی تلواروں پر

تم تو خیر آگ کے دریا سے گزر آئے ہو
اور وہ لوگ جو چلتے رہے انگاروں پر

شام سنولائے تو پلکوں پہ سجے دَرد کا شہر
آج یہ دھوپ تو جم سی گئی میناروں پر

کتنا بے رحم ہے برسات کا موسم، عرفانؔ
میں نے کچھ نام لکھے تھے انھیں دیواروں پر

○

وہ خُدا ہے کہ صنم، ہاتھ لگا کر دیکھیں
آج اس شخص کو نزدیک بُلا کر دیکھیں

ایک جیسے ہیں سبھی گلبدنوں کے چہرے
کس کو تشبیہہ کا آئینہ دکھا کر دیکھیں

کیا تعجّب کوئی تعبیر دکھائی دے جائے
ہم بھی آنکھوں میں کوئی خواب سجا کر دیکھیں

جسم کو جسم سے ملنے نہیں دیتی کم بخت
اب تکلّف کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں

خیر، دلّی میں تو اوراقِ مصوّر تھے بہت
لاؤ، اس شہر کی گلیوں میں بھی جا کر دیکھیں

کون آتا ہے یہاں تیز ہواؤں کے سوا
اپنی دہلیز پہ اک شمع جلا کر دیکھیں

وہ سمجھتا ہے یہ اندازِ تخاطب کہ نہیں
یہ غزل اُس غزل آرا کو سُنا کر دیکھیں

○

شہر میں گلبدناں، سیم تناں تھے کتنے
راہ زن درپئے نقدِ دل و جاں تھے کتنے

خوب ہے سلسلۂ شوق، مگر یاد کرو
دوستو، ہم بھی تو شیدائے بُتاں تھے کتنے

کچھ نہ سمجھے کہ خموشی مری کیا کہتی ہے
لوگ دلدادۂ الفاظ و بیاں تھے کتنے

تو نے جب آنکھ جھکائی تو یہ محسوس ہوا
دیر سے ہم تری جانب نگراں تھے کتنے